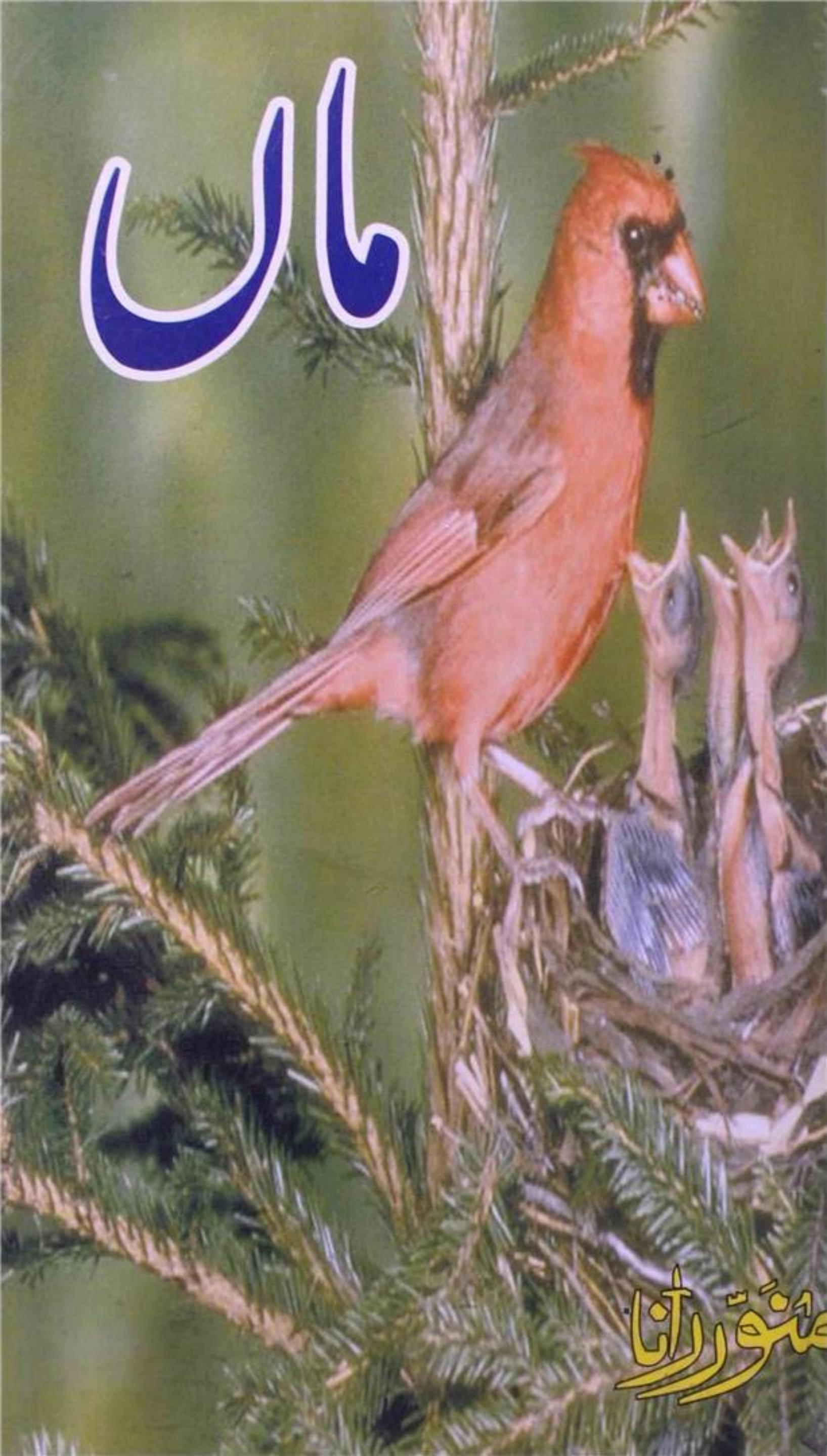


الله



صَنْوَرَانَا

مَا

منْوَر رانا

کاپی رائٹ اینڈ پبلشرز:

والی آسی اکیڈمی،

۸۔ فرست فلور، ایف۔ آئی۔ ڈھینگر اپارٹمنٹس،

لال کنواں، لکھنؤ۔ ۱۲۲۶۰۰ (یو۔ پی۔)

لے آؤٹ اینڈ ڈیلی پی:

جمیل احمد خاں

پر نظر:

نیچر آفیسٹ پرنٹر، دہلی

سرور ق ڈزاٹنگ:

جنید احمد، لکھنؤ

تصویر:

منے بخشی

زر تعاون: ۲۵ روپے

تعداد: ۵۰۰۰

۔

منور رانا

پتہ: C-10، بولاٹی دت اسٹریٹ،

کولکاتا۔ 700073

فون: (033) 22354230, 22353859

فیکس: (033) 22215534

دیگر تصمیفات

غزل گاؤں



پیپل چھاؤں



مور پاؤں



سب اسکے لے



نیم کے پھول



بدن سرائے



کہو ظل الہی



بغیر نقشے کام کا



گھر اکیلا ہو گے



سفید جنگلی کبوتر



اس طرح میرے گناہوں کو وہ دھو دیتی ہے
ماں بہت غصے میں ہوتی ہے تو رو دیتی ہے

ہراس بیٹے کے نام جسے ماں یاد ہے

اس کتاب سے حاصل کی گئی تمام آمدیں ”ماں فاؤنڈیشن“ کی جانب سے
ضرور تمندوں کی امداد کے لئے خرچ کی جائیں گے۔

منور رانا

Cell. 91-9415020167, 91-9839050450
e-mail : munawwarrana@hotmail.com

کچھ اپنی بات

غزل ہمیشہ تقید کے نشانے پر رہی ہے۔ زیادہ تر ناقدینِ ادب نے اسکی بے پناہ محبوبیت اور مقبولیت کے باوجود اسے منہہ نہیں لگایا۔ ہمیشہ اسکی کم مالگی اور ہل پسندی کا روناروٹے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل مدت توں کچھ بند ہے لیکے موضوعات کی امریں میں جکڑی رہی۔ حالانکہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس عہد کے مطابق غزل درباری آداب کے پیش نظر لکھی جاتی تھی۔ اسلئے شاعر ہمیشہ میخانے سے نکلتا ہوا، اور کوٹھوں سے اترتا دکھائی دیتا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت کے نوابین حضرات اور راجہ مہاراجہ شاعروں کی پورش ہی نہیں ناز برداری بھی کرتے رہتے تھے۔ تاریخ سے آنکھ پھولی کرتی ہوئی غزل جیسے ہی گلی کے موڑ، شہر کے چوراہوں، قصبات کے چبوتوں، گاؤں کی پکڑنڈیوں اور کھیت کھلیانوں میں بھی موضوعات کی تلاش میں بھٹکنے لگی تو اس نے نئے نئے منظرنامے تلاش کر لیے۔ خاص طور سے آزادی کے بعد تقسیم کی تلوار سے کٹے پھٹے رشتہوں کی بنتی بگڑتی تصویریوں، بھرے گھر میں تنہا ہونے کے احساس، بے سمتی کی طرف جاتی ہوئی تیز رفتار زندگی اور گھر آنکن میں ابھرتے ہوئے لائقی کے صحراؤں نے غزل کے لئے نئے نئے موضوعات کے ڈھیر لگا دیے۔

ہر خاص و عام لغت کے مطابق غزل کا مطلب محبوب سے باتیں کرنا ہے۔

اگر اسے بچ مان لیا جائے تو محبوب 'ماں' کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیا دنیا کے سب سے مضبوط، سدا بہار اور پاکیزہ رشتے کو غزل بنانا گناہ ہے، کیا تقدس کے "پھول بستر" پر غزل کو سُلانا جرم ہے۔ میری شاعری پر اکثر زیادہ پڑھے لکھے لوگ جذباتی استھصال کا ازام لگاتے رہے ہیں۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر محبوب کے حسن و شباب، اسکے تن و تو ش، اسکے لب و رخسار، اسکے رخ و گیسو، اسکے سینے اور کمر کی پیاس کو عیاشی کیوں نہیں کہا جاتا ہے!

اگر میرے شعر EMOTIONAL BLACKMAILING

ہیں تو پھر

"جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے۔"

"موسیٰ اب تو تیری وہ ماں بھی نہیں رہی جسکی دعائیں تجھے بچا لیا کرتی تھیں۔"

"اگر مرد کو دوسرا سجدے کی اجازت ہوتی تو ماں کے قدموں پر ہوتی۔"

"میدانِ حشر میں تمہیں تمہاری ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔" جیسے

جملے کیا بے معنی ہیں؟

میں پوری ایمانداری سے اس بات کا تحریری اقرار کرتا ہوں کہ میں دنیا کے سب سے مقدس اور عظیم رشتے کا پر چار صرف اسلئے کرتا ہوں کہ اگر میرے شعر پڑھکر ماں

کوئی بھی بیٹا اپنی ماں کا خیال کرنے لگے، رشتہوں کی نزاکت کا احترام کرنے لگے تو
شاید اسکے اجر میں میرے کچھ گناہوں کا بوجھ ہلاکا ہو جائے۔

یہ کتاب بھی آپکی خدمت تک صرف اسلئے پہوچانا چاہتا ہوں کہ آپ
میری اس چھوٹی سی کوشش کے گواہ بن سکیں اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں شامل کرتے
رہیں۔

ذرا سی بات ہے لیکن ہوا کو کون سمجھائے
دیئے سے میری ماں میرے لئے کاجل بناتی ہے

طالبِ دعا

منور ررانا

تمام عمر یہ جھو لا نہیں اترتا ہے

میری ماں بتاتی ہے کہ بچپن میں مجھے سوکھے کی بیماری تھی، ماں کو یہ بتانے کی ضرورت کیا ہے، مجھے تو معلوم ہی ہے کہ مجھے کچھ نہ کچھ بیماری ضرور ہے کیونکہ آج تک میں بیمارسا ہوں! دراصل میرا جسم بیماری سے رشتے داری نبھانے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ شاید اسی سوکھے کا اثر ہے کہ آج تک میری زندگی کا ہر کنوں خشک ہے، آرزو کا، دوستی کا، محبت کا، وفاداری کا! ماں کہتی ہے بچپن میں مجھے بنسی بہت آتی تھی، ہنستا تو میں آج بھی ہوں لیکن صرف اپنی بے بسی پر، اپنی ناکامی پر، اپنی مجبوریوں پر اور اپنی تنهائی پر لیکن شاید یہ بنسی نہیں ہے، میرے آنسوؤں کی گلزاری ہوئی تصویر ہے، میرے احساس کی بھلکلتی ہوئی آتما ہے۔ میری بنسی ”انشاء“ کی کھوکھلی بنسی، ”میر“ کی خاموش اداسی اور غالبَ کے ضدِ ی پھکڑ پن سے بہت ملتی جلتی ہے۔

میری بنسی تو میرے غموں کا لباس ہے۔ لیکن زمانہ اتنا کہاں غم شناس ہے پیوند کی طرح چمکتی ہوئی روشنی، روشنی میں نظر آتے ہوئے بجھے بجھے چہرے، چہروں پر لکھی داستانیں، داستانوں میں چھپا ہوا ماضی، ماضی میں چھپا ہوا بچپن، جگنوں کو چنتا ہوا بچپن، تبلیوں کو پکڑتا ہوا بچپن، پیڑ کی شاخوں سے جھولتا ہوا بچپن، کھلونوں کی دکانوں کو تکتا ہوا بچپن، باپ کی گود میں ہنستا ہوا بچپن، ماں کی آنکھ میں مسکراتا ہوا بچپن، مسجدوں میں نمازیں پڑھتا ہوا بچپن، مدرسوں میں سپارے رشتا ہوا

بچپن، جھیل میں تیرتا ہوا بچپن، دھول مئی سے سنورتا ہوا بچپن، ننھے ننھے ہاتھوں سے دعا میں مانگتا ہوا بچپن، غلیل سے نشانے لگاتا ہوا بچپن، پتنگ کی ڈور میں الجھا ہوا بچپن، نیند میں چونکتا ہوا بچپن، خدا جانے کن بھول بھلوں میں کھو کر رہ گیا ہے، کون سنگ دل ان سنہرے دنوں کو مجھ سے چھین لے گیا ہے۔ ندی کے کنارے بالو سے گھروندے بنانے کے دن کہاں کھو گئے، ریت بھی موجود ہے، ندی بھی ناگنوں کی طرح بل کھا کر گزرتی ہے لیکن میرے یہ ہاتھ جو محل تعمیر کر سکتے ہیں، اب گھروندے کیوں نہیں بناتے، کیا پراٹھے روٹیوں کی لذت چھین لیتے ہیں، کیا پستی کو بلندی اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتی، کیا امیری، غربی کا ذائقہ نہیں پہچانتی، کیا جوانی بچپن کو قتل کر دیتی ہے؟

مئی اور جون کی تیز دھوپ میں ماں چھپتی رہتی تھی اور بچپن پیڑ کی شاخوں پر جھولا کرتا تھا، کیا دھوپ چاندنی سے زیادہ حسین ہوتی ہے، ماچس کی خالی ڈبیوں سے بنی ریل گاڑی کی پڑیاں چڑا کر کون لے گیا، کاش کوئی مجھ سے کاروں کا یہ قافلہ لے لے اور اس کے بد لے میں میری وہی چھٹک چھٹک کرتی ہوئی ریل گاڑی مجھے دے دے، کیونکہ لو ہے اور اسٹیل کی بنی ہوئی گاڑیاں وہاں نہیں رکتیں جہاں بھولی بھالی خواہیں مسافروں کی طرح انتظار کرتی ہیں، جہاں معصوم تمدنامیں ننھے ننھے ہونٹوں سے بخنے والی سٹیوں پر کان لگائے رہتی ہیں۔

کوئی مجھے میرے گھر کے سامنے والا کنوں والا پس لادے جو میری ماں کی
طرح خاموش اور پاک رہتا تھا، میری خالہ جب مجھے اپنے گاؤں لے کر چلی جاتیں تو
ماں خوفزدہ ہو جاتی تھی کیونکہ میں سوتے میں چلنے کا عادی تھا۔ ماں ڈرتی تھی کہ میں
کہیں آنگن کے کنوں میں نہ گر پڑوں، ماں رات بھر رور کر کنوں سے کہتی رہتی کہ
اے پانی! میرے بیٹے کو ڈوبنے مت دینا۔ ماں سمجھتی تھی کہ شاید پانی سے پانی کا رشتہ
ہوتا ہے، میرے گھر کا کنوں بہت حساس تھا، ماں جتنی دیر کنوں سے با تیں کرتی تھی
کنوں اپنے ابنتے ہوئے پانی کو پُرسکوت رہنے کا حکم دیتا تھا، شاید وہ میری ماں کی
بھولی بھالی خواہشوں کی آہٹ کو احترام سے سننا چاہتا تھا، پتہ نہیں یہ پاکیزگی اور
خاموشی ماں سے کنوں نے سکھی تھی یا کنوں سے ماں نے؟

گرمیوں کی دھوپ میں جب ٹوٹے ہوئے ایک چھپر کے نیچے ماں لو اور
دھوپ سے ٹاٹ کے پردوں کے ذریعے مجھے بچانے کی کوشش کرتی تو مجھے اپنے آنگن
میں دانا چکتے ہوئے چوزے بہت اچھے لگتے جنہیں ان کی ماں ہر خطرے سے بچانے
کے لئے اپنے نازک پروں میں چھپا لیتی تھی۔ ماں کی محبت کے آنچل نے مجھے تو ہمیشہ
محفوظ رکھا لیکن غربی کے تیز جھکڑوں نے ماں کے خوبصورت چہرے کو جھلسا جھلسا کر
سانو لا کر دیا۔ گھر کے کچھ آنگن سے اڑنے والی پریشانی کی دھوں نے میری ماں کا
رنگ مت میلا کر دیا۔ دادی بھی مجھے بہت چاہتی تھیں وہ ہر وقت مجھے ہی تکا کرتیں،
شاید وہ میرے بھولے بھالے چہرے میں اپنے اس بیٹے کو تلاش کرتی رہتی تھیں جو

ٹرک ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا شیرشاہ سوری کے بنائے ہوئے راستوں پر ہمیشہ گرم سفر رہتا تھا۔

شیرشاہ سوری کی بنوائی ہوئی وہ تاریک سڑک گنہ گار دلوں کی طرح رہ رہ کر ٹرک اور کاروں کی ہیڈ لائٹوں سے یوں چمکنے لگتی ہے جیسے اس بے ایمان زمانے میں کہیں کہیں ایمان داری کی کرن دکھائی پڑ جاتی ہے۔ شیرشاہ سوری کی وہ طویل سڑک جسکے سینے پر روزانہ ہزاروں گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں لیکن یہ بے جان سڑک بہار کے کسی ہریجگی قبیلے کی طرح دکھوں کا بوجھ اٹھائے چپ چاپ مسکراتی رہتی ہے۔ نہ جانے کتنے ہی ڈرائیور اپنے پھول سے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لئے تیوہاروں کو بھلاتے ہوئے، موسموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، زندگی کو داؤں پر لگاتے ہوئے اس پرانی سڑک سے گزرتے رہتے ہیں۔ تھکی تھکی اور پراسراری یہ سڑک آئے دن انسانوں کا خون پیکراپنی پیاس بجھاتی رہتی ہے۔ سرخ انسانی خون جوتا کوں کی کالی سڑک پر ذرا سی دیر میں خشک ہو کر سیاہ ہو جاتا ہے۔ خون کے اس دھبے کو بھی ذرا سی دیر میں وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کے نرم اور کالے ٹاٹر چاٹ جاتے ہیں۔ وہ دھبے جن میں کسی سہاگ کی سرخی، کسی ماں کا انتظار اور کسی بہن کے میلے سے دوپٹے کے آنسو بھی شامل ہوتے ہیں۔

خبر نہیں مجھے یہ زندگی کہاں لے جائے۔ کہیں ٹھہر کے مر انتظار مت کرنا

ایک سیاسی لکیر نے سب کچھ تقسیم کر دیا، ملک کو، قوم کو، رشتہوں کو، مجرموں کو،
ندیوں تالابوں کو۔ ایک گھونسلے کے کئی حصے ہو گئے، ایک گھر کے کئی نکڑے ہو گئے،
کشوؤین کی چکنی میں اجداد کی عمارتیں پس گئیں، خاندانوں کی مشیوں سے زمینداری
کی بالوسرک گئی، جاگیرداری کے چہرے سے وقار اور اعتماد کا رنگ دروغن اڑ گیا،
خاندانی زیورات (جنہیں غیر مردوں نے دیکھا تک نہیں تھا) ساہو کاروں کی
تجویں میں قید ہو گئے، پاکستان بن گیا، علامہ اقبال کی پیشین گوئی، جتاج کا خواب
تعبر کی جستجو میں بھٹکتا ہوا پنجاب کے اس پار پہونچ گیا، رفتہ رفتہ ہر گھر میں پاکستان
تعمیر ہونے لگا۔ میرے بھی رشتہ دار اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے پاکستان روانہ ہو
گئے۔ پنجاب میں جو ہر زمانے میں جدائی کی کہانی میں ایک نیا روں ادا کرتا ہے
میرے گھر کے مردوں اور سفید کالے برقوں میں سہمی سکھی ہوئی عورتوں کو لے کر اس
مہاجر خانے کی طرف روانہ ہو گیا جسے لوگ پاکستان کہتے ہیں۔ میں چپ چاپ اپنی
دادی سے چھٹا رہا۔ میرے چھپانے دادی سے پاکستان چلنے کو کہا اور وہ بھی مہاجرین
کے خیمے کی طرف جانے کو تیار ہو گئیں۔ میں دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا یہ سوچتا ہی
رہ گیا کہ میری دادی مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گی اور شاید پہلی بار یہ محاورہ غلط ہو گیا کہ
اصل سے زیادہ سود پیارا ہوتا ہے۔

ریل گاڑی کے کوئے والے ان جن سے نکلتے ہوئے دھویں نے میرے والد
کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو میلا کر دیا۔ اب وہ اس ملک میں اکیلے رہ گئے تھے۔ بالکل اس

پرندے کی طرح جسکے سب ساتھی جال میں پھنس گئے ہوں۔ پھر جیسے ہی ریل گاڑی کی سیٹی نے سکیاں لیں، کارروائی اپنی انجانی سی منزل کی طرف روانہ ہو گیا، پلیٹ فارم کے کنارے کھڑے ہوئے میرے والد لڑکھڑائے، میں نے لپک کر سہارا دینا چاہا، انہوں نے اپنا جسم میرے حوالے کر دیا اور میں اسی دن جوان ہو گیا۔ ضرورت کی ریل گاڑی میں بیٹھ کر میرا بچپن جوانی کے شہر میں آگیا، کونکے سے دیواروں پر نام لکھنے کا موسم چلا گیا۔ تختی پر کھریا مٹی سے سبق لکھنے کے دن چلے گئے، روٹی کی ڈلیا کے سہارے چڑیاں پکڑنے کا کھیل ختم ہو گیا۔ اب ماں سر میں سفید نہیں کالے بال ڈھونڈتی ہے۔ یہ تلاش و جستجو کا طویل سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا، کبھی کوکھ اولاد کو تلاش کرتی ہے، کبھی اولاد ماں کی مقدس آغوش کو۔

میرا بچپن تھا مر اگر تھا کھلونے تھے مرے۔ سر پہ ماں باپ کا سایہ بھی غزل جیسا تھا



عمر بھر دھوپ میں پیر جلتا رہا

زخم کیا بھی ہو کر یہ تو اچھا لگتا ہے۔ ماضی کیا بھی رہا ہو سوچئے تو مزہ آتا ہے۔ بچپن جیسا بھی گزر اور اج سنگھاسن سے اچھا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم زمینداری کیسی ہوتی ہے کیونکہ میں نے بارہ ماں کو بھوکے پیٹ سوتے دیکھا ہے۔ مجھے کیا پتہ زمیندار کیسے ہوتے ہیں، کیونکہ میں نے مدتیں اپنے ابو کے ہاتھوں میں ٹرک کا اسٹرینگ دیکھا ہے۔ میں نے بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ ممکن ہے میرے ابو نے بھی خواب دیکھے ہوں کیونکہ ایک تھا کامنڈاٹرک ڈرائیور بہت بے خبری کی نیزند سوتا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے میری ماں نے کبھی خواب نہیں دیکھا تھا کیونکہ خواب تو وہ آنکھیں دیکھتی ہیں جو سوتی ہیں، لیکن میں نے اُمی کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انکی آنکھیں ہمیشہ گھر کی دہلیز پر اور جسم جانماز پر رکھا دیکھا ہے اور جوانی اس ٹرک ڈرائیور کے انتظار میں قطرہ قطرہ لکھلتے دیکھی ہے جو میرے ابو بھی تھے اور اُمی کے سر کا آنچل بھی۔

رائے بریلی سے میرا ناہال صرف بیس میل کے فاصلے پر تھا لیکن غربت فاصلے بڑھادیتی ہے، لفافے اور پوسٹ کارڈ کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ غربت میں رشتہ دار بھی دور کا چراغ معلوم ہوتے ہیں۔ غربت میں وہ نشہ ہے جس میں خدا بھی رشتہ دار

معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے خدا آسمان پر بہت بڑے گھر میں رہتا ہو لیکن زمین پر وہ صرف غریب آدمی کے دل میں رہتا ہے۔ غربت میں کروندے اور بیر کے کانٹے انگلیوں سے خون نکال کر اسکی جانچ کر لیتے ہیں۔ خون کی بوندوں کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے کسی لمپوریٹری میں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی، غربت کے وہ دن بھی کیا ہوتے ہیں جب شوکیس میں رکھی ہوئی گڑیا کو دیکھنے کے لئے غربی احتیاطاً ہاتھ منہہ دھولیتی ہے۔

ایک دن میرے ابوگھر آئے۔ میری امی نانی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ میرے دو چھوٹے بھائی بھی امی کے ساتھ چلے گئے تھے (ایک چھوٹا بھائی یجی رانا تقریباً ۱۲ رہرس پہلے عین نوجوانی کے عالم میں جیپ کے حادثے میں مالکِ حقیقی سے جاملا)۔ میں گھر پر اپنی دادی کے پاس تھا۔ کیونکہ دادی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ پتہ نہیں لڑکوں سے دادی کو اور لڑکیوں سے نانی کو اتنی محبت کیوں ہوتی ہے۔ شاید نانی دخترزادی میں اپنی بیٹی تلاش کر لیتی ہے اور دادی پوتے میں اپنا بیٹا ڈھونڈ لیتی ہے۔ ابو مجھے ٹرک پر بٹھا کر نانہاں کی طرف چل دئے۔ جہاں تک ٹرک جاسکتا تھا ابو ٹرک چلا کر لے گئے پھر ایک جگہ ٹرک روک دیا اور مجھے ساتھ لے کر پیدل ہی گاؤں کی طرف چل دئے۔ غالباً دو ڈھائی میل کا فاصلہ رہا ہوگا۔ پکڑنڈیوں پر چلنے کی عادت نہ ہونے سے مجھے یوں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ پھر سفر بھی لمبا تھا، چلتے چلتے میں ابو سے بہت پیچھے ہو جاتا۔ وہ مڑکر دیکھتے تو میں پھر دوڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتا۔ بچپن میں باپ بھی

حضر علیہ السلام معلوم ہوتا ہے۔ قدرت یہ احساس صرف بچپن کو ہی عطا کرتی ہے۔ اچانک ابو ایک جگہ اکڑوں بیٹھ گئے اور بولے تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، میں نے کہا نہیں ابو جان! آپ تھک جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا آپ کے کندھے پر نہیں بیٹھوں گا۔ ابو نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولے تم بوجہ نہیں ہو میرے بیٹھے ہو، میں تھکوں گا نہیں۔ یہ کہکر انہوں نے زبردستی مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لیا اور کہنے لگے ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے کندھے پر بٹھا کر چل رہا ہوں۔ جب تم بڑے ہونا تو مجھے کارلا کر دینا۔ اس وقت میری عمر مشکل سے سات آٹھ برس رہی ہو گی۔

بچپن خوشبو کی طرح ہوتا ہے بہت دنیہیں بھہرتا یا بچپن کو پر لگ جاتے ہیں۔ دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ کچھ ہی برسوں بعد سارا خاندان پاکستان چلا گیا۔ جیسے طاعون میں گاؤں صاف ہو جاتے ہیں، جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے، جیسے رنگت کو دھوپ کھا جاتی ہے، جیسے کردار کو شہر کھا جاتے ہیں، جیسے ایمان کو ہوس نگل لیتی ہے، جیسے حویلیوں کو انا کھا جاتی ہے، جیسے آئینے کو ویرانی کھا لیتی ہے۔ شاید آئینہ چہرہ دیکھنے کے لئے ہوتا ہے اور ڈھال میدان میں تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے لشکر کو دیکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ سیاست کی بساط پر دنیا کی سب سے ذہین قوم مہر انکر رہ گئی۔ تقسیم کے کھیل میں پاکستان جیت گیا مگر مسلمان ہار گئے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ کیسی شکست تھی جس کا احساس باون برس گزر جانے کے بعد بھی باقی ہے۔ یہ کیسا زخم تھا جسکی کسک ہر مرنے والے کے چہرے سے اتر کر پیدا ہونے والے

کے چہرے پر چپک جاتی ہے۔ یہ کیسی ندامت تھی جسے تین نسلوں کے آنسو بھی نہیں دھو سکے۔ یہ کیسی تقسیم تھی جس کا حصہ آج تک نہیں لگ سکا۔ یہ کیسا فیصلہ تھا جس نے تاج محل کے دوٹکڑے کردئے، کشمیر کے دو حصے ہو گئے، جامع مسجد آدمی ہو گئی، غزل نے مریشے کا روپ دھار لیا، اردو زبان سرحد کی سولی پر لٹکا دی گئی اور فرار کو ہجرت کا لقب دے دیا گیا۔

ایک ٹوٹے سے گھر میں بارشوں میں ٹکتے ہوئے چھپر کے نیچے ابو نے اپنی گیلی مٹی جیسے بچوں کو اس سیدھی سادی پر دہ دار خاتون کے سپرد کر دیا جو میری ماں تھی اور خود اللہ کا نام لے کر اپنے بازوؤں کے بھرو سے روزی کی تلاش میں شب و روز شیر شاہ سوری کی بنوائی سڑک کے پیچ و خم سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ابو کبھی ہفتے بھر بعد آتے، کبھی دس دنوں بعد واپسی ہوتی، کبھی تھوڑی دیر پھر تے، کبھی تھوڑے دن پھر تے اور پھر ہم لوگوں کے روشن مستقبل کی تلاش میں ٹرک کا اسٹیرنگ تھام لیتے۔ وہ ساری زندگی ونڈا اسکرین گلاس سے سڑک کے بجائے ہمارے مستقبل کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ مستقبل کا خواب بھی وہ نشہ ہوتا ہے جو ساری عمر نہیں اترتا، وہ الہر شباب ہوتا ہے جس سے بڑھا پا کترا کے گزرتا ہے۔ وہ طوفان ہوتا ہے جسے باندھا نہیں جا سکتا۔

ابو ہم لوگوں کے بارے میں سوچتے بہت تھے۔ انہیں کوئی بھی موسم ڈرانہیں پاتا تھا۔ وہ لوڈھوپ کی شدت کے زمانے میں انگوچھا بھگوکر سر پر لپیٹ لیتے تھے۔

بارہا انہوں نے رائے بریلی سے کلکتہ تک پنجاب میل کے ڈرائیور کو آگے نہیں نکلنے دیا۔ رفتہ رفتہ گاڑی چلانا ازکا پیشہ ہی نہیں شوق بنکر رہ گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ٹرک چلانے میں گزار دیتے تھے لیکن وہ ہم لوگوں سے غافل نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ اس خیال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے تھے کہ پتہ نہیں گھر پر چولہا جلا بھی ہو گا یا نہیں؟ اور اکثر ایسا ہوتا بھی تھا کہ میرے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ اُمی ہم لوگوں کو رشتہ کی ایک پھوپھی کے گھر بھیج دیتیں اور خود خالی پیٹ سو جاتی تھیں یا جانماز پر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ابوآگ سے بہت ڈرتے تھے، راستے میں اگر کہیں آگ لگی دیکھ لیتے تھے تو فوراً یہ خیال پریشان کرنے لگتا تھا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ گھر میں آگ لگ گئی تو کیا ہو گا؟ میری اُمی میرے گھر کی روایتی پردہ داری کی طرفدار بھی تھیں اور نگہبان بھی۔ ہم لوگوں کے کپڑے خواہ پھٹے ہوئے کیوں نہ ہوں لیکن گھر کے دروازے پر ہمیشہ ایک مضبوط پردہ جھولتا رہتا تھا۔

وقت کو دبے پاؤں چلنے کی اتنی عادت ہے کہ محسوس ہوئے بغیر گزر جاتا ہے۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں ابو نے کلکتہ میں ٹرانسپورٹ کا چھوٹا سا کام شروع کیا۔ ۱۹۶۷ء میں اُمی اور چھوٹے بھائی بہن بھی کلکتہ چلے گئے۔ ہم تین بھائی ابو کے خالہ زاد بھائی یونس صوفی (جنہیں ہم لوگ چھا جان کہتے تھے) کے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں ابو، ہم لوگوں کو بھی لے کر کلکتہ چلے آئے۔ محمد جان اسکول سے ہائر سکندری کرنے کے بعد میرا داخلہ امیش چندر کالج میں بی کام میں ہو گیا۔ تعلیم مکمل

کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ ایک تو مجھے شاعری، ڈرامہ نگاری اور اسٹیج پروگرام کا
چسکہ لگ گیا، دوسرے اچانک ابو بیمار ہو کر اسلامیہ اپنال میں بھرتی ہو گئے۔ تقریباً
چھیس دنوں تک اپنال میں رہے۔ پڑھائی سے میرا جی اچانک ہو گیا اور میں ابو کے
ساتھ ٹرانسپورٹ کے آفس میں بیٹھنے لگا۔ ابو کو شاعری بہت پسند تھی۔ سوز سکندر پوری،
پروفیسر اعزاز افضل، راز الہ آبادی اور نازش پرتاپ گڑھی سے انکے بہت گھرے
مراسم تھے۔ اپنے آخری دنوں میں اعزاز افضل کا یہ شعر مستقل پڑھتے رہتے تھے:

افضل کا مقدر ہے حق گوئی و بے باکی۔ سچ بات کہی ہو گی جھٹلائے گئے ہوں گے
لیکن وہ اس بات پر قطعی راضی نہیں تھے کہ میں شاعر بنوں۔ لیکن تقدیر کے
لکھنے کو کیے ٹالا جاسکتا ہے۔ میں بگڑتے بگڑتے ایک دن شاعر بن ہی گیا لیکن ابو کے
خون پسینے سے سینچنے ہوئے کاروباری پودے پر کبھی دھوپ چھاؤں کا اثر نہیں ہونے
دیا۔ کاروباری گذی پر بٹھاتے وقت ابو نے پندرہ میں ہزار روپیوں کے ساتھ
ایمانداری، بے باکی، حق گوئی اور شرافت کی جو پونچی میرے حوالے کی تھی خدا کا شکر
ہے کہ میں نے اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ابوکلکتہ سے واپس رائے بریلی^۱
آگئے:

مہاجر ویہی تاریخ ہے مکانوں کی۔ بنانے والا ہمیشہ برآمدوں میں رہا
چھوٹے بھائی کی موت کے بعد ابوٹوٹ پھوٹ گئے، لیکن وہ کبھی اس کا

اظہار نہیں ہونے دیتے تھے لیکن اندر اندر دھوپ میں رکھی برف کی طرح پکھلنے لگے۔ ہم سب بھائی ان کو کسی بھی طرح خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ ہر طرح انکی دل جوئی میں مصروف رہتے، لیکن اب ایک طرح سے وہ اس بچے کی طرح ہو گئے تھے جو بہت ڈرا ہوا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کورات کے سفر سے منع کرتے تھے لیکن چونکہ ٹرانسپورٹ کے کام میں جب تک ہیڈ لائٹ ساتھ دے رات کورات نہیں کہا جاتا۔ لہذا اس مجبوری کی وجہ سے ہمارا راتوں کا سفر ابوکو بھی گھر میں جگائے رکھتا تھا۔ ہفتوں گھر کا منہہ نہ دیکھنے والے ابواب کہیں بھی جاتے تو کوشش یہی کرتے کہ رات ہونے سے پہلے پہلے وہ رائے بریلی واپس آ جائیں۔ سمندر کی لہروں پر چلنے والا مسافر اب ندی کے کنارے بیٹھ کر وضو کرتے ہوئے بھی تھک جاتا تھا۔ ابوانے چہرے سے اور خاص طور پر اپنی آواز سے کبھی اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ مجھے دیر رات میں فون کرنے والے اکثر دھوکہ کھا جاتے تھے۔ اگرچہ یہی کی موت کے بعد ابو بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر انکی آواز میں کبھی لوچ نہیں آیا تھا۔

۱۹۹۹ء کے بعد ابو بالکل کمزور ہو گئے تھے۔ دونوں گردوں نے کام کرنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ ہفتے میں دو بار رائے بریلی سے لکھنؤ ڈائیکس کے لئے لائے جاتے۔ اس کے باوجود ان کی خود اعتمادی میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ کبھی کبھی تو انکے چہرے پر زندگی کی چمک دیکھ کر موت بھی ما یوسی کا شکار ہو جاتی رہی ہوگی۔

ایک دن میں نے سوچا کہ ابو کی 'زین' کا رپرانی ہو گئی ہے۔ نئی کار لائی جائے تو ممکن ہے کہ ابو کی زندہ رہنے کی امنگ بڑھ جائے۔ میں کلکتہ گیا تو انکے لئے ایک 'ٹانٹا سفاری' خریدی۔ جب کسی نے ابو کو بتایا کہ چچا آپ کے لئے بھیا نے سفاری خریدی ہے تو ابو بستر پر اٹھکر بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح پوچھا "شہر میں یہ گاڑی کسی کے پاس ہے؟" جب یہ بیاتا گیا کہ ابھی یہ گاڑی پورے ضلع میں کسی کے پاس نہیں ہے تو سنکر مسکرانے اور بچوں کی طرح لیٹ کر سو گئے۔ جس دن کلکتہ سے سفاری آئی ابو ڈاکس کے لئے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔

شام کو کچھری والوں کی طرف سے 'ہندی دوس' کے موقع پر فیروز گاندھی کالج کے آڈیٹوریم میں ایک کوئی سمیلن تھا۔ رائے بریلی کے ضلع بحاج محترم پی ڈی کوشک صاحب اردو سے محبت کرتے تھے، اسی نسبت سے وہ میرا بھی خیال کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت نامہ اس تاکید کے ساتھ بھجوایا تھا کہ آپ کو شریک ہونا ہے۔ میں شام کو کوئی سمیلن میں جانے کے لئے نکلا۔ کار ابو کو لیکر ابھی لوٹی نہیں تھی۔ ڈرائیور پختے خاں جو سفاری کلکتہ سے چلا کر لائے تھے، کہنے لگے چلنے میں آپ کے ساتھ کوئی سمیلن میں چلتا ہوں۔ میں نے منع کیا تو بولے میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں ابھی سفاری پر نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ ابھی تک اس گاڑی کا اصلی مالک اس گاڑی پر نہیں بیٹھا ہے۔ یہ سنکر پختے خاں بھی رنجیدہ ہو گئے اور میں چپ چاپ سر جھکائے سڑک پر آ گیا اور رکشے پر بیٹھ کر فیروز گاندھی ڈگری کالج کی طرف

روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے آڈیٹوریم کے صدر دروازے پر ضلع بحق صاحب مل گئے۔ انہوں نے مجھے رکھنے کے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور شکایتی لجھے میں بولے کہ آپ نے فون کر دیا ہوتا۔ کوئی بھی گاڑی چلی جاتی اور آپکو لے آتی۔ میں نے انکا شکر یہ ادا کرتے ہوئے انکو یاد دلا�ا کہ آپ نے ایک بار یہ قصہ سنایا تھا کہ اللہ آباد کے کسی مندر میں ایک راجہ پہنچا اور اس نے مندر کے پنجاری سے پوچھا کہ پنجاری جی کیا کبھی کسی نے اس مندر پر چڑھاوے میں دوسرے سونا چڑھایا ہے؟ پنجاری جی بولے نہیں مہاراج ابھی تک تو ایسا کوئی بھی دانی ادھر سے نہیں گزرا۔ راجہ نے مسکرا کر کہا تو سمجھ لیجئے وہ دانی شہر میں آچکا ہے۔ کل میں مندر میں دوسرے سونا چڑھاؤں گا۔ پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ لیئے اور بولے لیکن مہاراج میں یہ چڑھاوا لینے سے انکار کرتا ہوں۔ راجہ نے پوچھا پنڈت جی آپ یہ چڑھاوا لینے سے انکار کیوں کر رہے ہیں؟ پنڈت جی نے پھر ہاتھ جوڑ لیئے اور بولے مہاراج، مندر میں دوسرے سونا چڑھانے والے تو ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ممکن ہے میرے بعد کوئی انکار کرنے والا نہ پیدا ہو۔ ضلع بحق صاحب نے مجھے الجھی ہوئے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے بھی ہاتھ جوڑ لیئے کہ جناب میں اپنے دروازے پر سفاری چھوڑ کر اسلئے آیا ہوں کہ ہر دور میں سفاری جیسی مہنگی اور اس سے بھی مہنگی گاڑیوں پر بیٹھ کر لوگ کوئی ستمیلن میں آتے رہیں گے لیکن ممکن ہے میرے بعد قیمتی کار چھوڑ کر رکھنے پر بیٹھ کر آنے والا نہ پیدا ہو۔

ابو صرف ایک بار اس گاڑی پر بیٹھ سکے کیونکہ اگلے ہفتے اُمی اپنی کلامی کی سب چوریاں توڑ چکی تھیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے سفاری کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ تقریباً ۶ رہمینے تک گاڑی یوں ہی کھڑی رہی۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اس پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔ پھر ایک دن میرے ایک محسن نے مجھ سے وہ گاڑی کچھ دنوں کے لئے مانگ لی۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی انکے گھر پر کھڑی کروادی اور آج تک واپس لانے کی ہمت نہیں کر سکا۔

مجھے معلوم نہیں روایتی شاعری، ترقی پسند ادب، جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت کے کہتے ہیں۔ میں تو آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی کے لباس سے آراستہ کر کے غزل بناتا ہوں۔ آپ کو اچھی لگے تو شکریہ، نہ اچھی لگے تو بھی شکریہ۔

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتے رہے، اپنی شاخیں شمردار کرتے رہے



ماں

ہنستے ہوئے ماں باپ کی گالی نہیں کھاتے
بچے ہیں تو کیوں شوق سے مٹی نہیں کھاتے

ہو چاہے جس علاقے کی زبان بچے سمجھتے ہیں
سکی ہے یا کہ سوتیلی ہے ماں بچے سمجھتے ہیں

ہوا دکھوں کی جب آئی کبھی خزان کی طرح
مجھے چھپا لیا مٹی نے میری ماں کی طرح

سکیاں اسکی نہ دیکھی گئیں مجھ سے رانا
رو پڑا میں بھی اسے پہلی سماں دیتے

سرپھرے لوگ ہمیں دشمنِ جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں

مجھے بس اسلئے اچھی بہار لگتی ہے
کہ یہ بھی ماں کی طرح خوشگوار لگتی ہے

میں نے روتے ہوئے پونچھے تھے کسی دن آنسو
مدتوں ماں نے نہیں دھویا دوپٹہ اپنا

بھیجے گئے فرشتے ہمارے بچاؤ میں
جب حادثات ماں کی دعا سے الجھ پڑے
لبوں پر اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

تار پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو سوتا دیکھ کر
فرش پر سوتا ہوا بیٹا بہت اچھا لگا

اس چہرے میں پوشیدہ ہے اک قوم کا چہرہ
چہرے کا اتر جانا مناسب نہیں ہوگا

اب بھی چلتی ہے جب آندھی کبھی غم کی راننا
ماں کی متا مجھے باہوں میں چھپا لیتی ہے

مصیبت کے دنوں میں ماں ہمیشہ ساتھ رہتی ہے
پیغمبر کیا پریشانی میں اُمت چھوڑ سکتا ہے

پرانا پیر بزرگوں کی طرح ہوتا ہے
یہی بہت ہے کہ تازہ ہوا میں دیتا ہے

کسی کے پاس آتے ہیں تو دریا سوکھ جاتے ہیں
کسی کی ایڑیوں سے ریت میں چشمہ نکتا ہے

جب تک رہا ہوں دھوپ میں چادر بنا رہا
میں اپنی ماں کا آخری زیور بنا رہا

دیکھ لے ظالم شکاری ماں کی متادیکھ لے
دیکھ لے چڑیا ترے دانے تک تو آگئی

مجھے بھی اس کی جدائی ستاتی رہتی ہے
اسے بھی خواب میں بیٹا دکھائی دیتا ہے

مفلسی گھر میں نہ ہرنے نہیں دیتی اس کو
اور پرڈلیس میں بیٹا نہیں رہنے دیتا

اگر اسکوں میں بچے ہوں گھر اچھا نہیں لگتا
پرندوں کے نہ ہونے سے شجر اچھا نہیں لگتا

گلے ملنے کو آپس میں دعائیں روز آتی ہیں
ابھی مسجد کے دروازے پہ ماں میں روز آتی ہیں

کبھی کبھی مجھے یوں بھی اذان بلاتی ہے
شریعہ پچے کو جس طرح ماں بلاتی ہے

کسی کو گھر ملا حصہ میں یا کوئی دکان آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصے میں ماں آئی

اے اندھیرے دیکھ لے منہہ تیرا کالا ہو گیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں گھر میں اجالا ہو گیا

اس طرح میرے گناہوں کو وہ دھو دیتی ہے
ماں بہت غصے میں ہوتی ہے تو رو دیتی ہے

میری خواہش ہے کہ میں پھر سے فرشتہ ہو جاؤں
ماں سے اس طرح لپٹ جاؤں کہ بچہ ہو جاؤں

مرا خلوص تو پورب کے گاؤں جیسا ہے
سلوک دنیا کا سوتیلی ماوں جیسا ہے

روشنی دیتی ہوئی سب لاثمنیں بجھ گئیں
خط نہیں آیا جو بیٹوں کا تو ماں میں بجھ گئیں

وہ میلا سا بوسیدہ سا آنچل نہیں دیکھا
برسون ہوئے ہم نے کوئی پیپل نہیں دیکھا

کئی باتیں محبت سب کو بنیادی بتاتی ہے
جو پردادی بتاتی تھی وہی دادی بتاتی ہے

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لئے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

ہوا اڑائے لئے جا رہی ہے ہر چادر
پرانے لوگ سبھی انتقال کرنے لگے

اے خدا پھول سے بچوں کی حفاظت کرنا
مفلسی چاہ رہی ہے مرے گھر میں رہنا

ہمیں حریقوں کی تعداد کیوں بتاتے ہو
ہمارے ساتھ بھی بیٹا جوان رہتا ہے

خود کو اس بھیڑ میں تنہا نہیں ہونے دینگے
ماں تجھے ہم ابھی بوڑھا نہیں ہونے دینگے

پیڑ امیدوں کا یہ سوچ کے کاثا نہ کبھی
پھل نہیں آئیں گے اس میں تو ہوا ہی دے گا

سکھ دیتی ہوئی ماوں کو گفتی نہیں آتی
پیپل کی گھنی چھاؤں کو گفتی نہیں آتی

لپٹ کے روتی نہیں ہیں کبھی شہیدوں سے
یہ حوصلہ بھی ہمارے وطن کی ماوں میں ہے

یہ سوچ کے ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوں
اس پیڑ کا سایہ میرے بچوں کو ملے گا

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھرنہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

جہاں پچھلے کئی برسوں سے کالے ناگ رہتے ہیں
وہاں اک گھونسلہ چڑیوں کا تھا دادی بتاتی ہے

یاروں کو مسرت میری دولت پہ ہے لیکن
اک ماں ہے جو بس میری خوشی دیکھ کے خوش ہے

سمجھو کہ صرف جسم ہے اور جاں نہیں رہی
وہ شخص جو کہ زندہ ہے اور ماں نہیں رہی

پر دلیں جا رہے ہو تو تعویذ باندھ لو
کہتی ہیں ماں میں بچوں سے اپنے پکار کے

نکلنے ہی نہیں دیتی ہیں اشکوں کو مری آنکھیں
کہ یہ بچے ہمیشہ ماں کی نگرانی میں رہتے ہیں

تیرے آگے ماں بھی موئی جیسی لگتی ہے
تیری گود میں گنگا میتا اچھا لگتا ہے

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہونگے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

لپٹ جاتا ہوں ماں سے اور موئی مسکراتی ہے
میں اردو میں غزل کہتا ہوں ہندی مسکراتی ہے

جو بھی دولت تھی وہ بچوں کے حوالے کر دی
جب تملک میں نہیں بیٹھوں یہ کھڑے رہتے ہیں

جب بھی دیکھا مرے کردار پہ دھبہ کوئی
دیر تک بیٹھ کے تنہائی میں رویا کوئی

خدا کرے کہ امیدوں کے ہاتھ پیلے ہوں
ابھی تک تو گزاری ہے عدوں کی طرح

گھر کی دلیز پہ روشن ہیں وہ بجھتی آنکھیں
مجھ کو مت روک مجھے لوٹ کے گھر جانا ہے

یہیں رہوں گا کہیں عمر بھر نہ جاؤں گا
زمین ماں ہے اسے چھوڑ کر نہ جاؤں گا

ائشیں سے واپس آکر بوڑھی آنکھیں سوچتی ہیں
پتے دیہاتی رہتے ہیں پھل شہری ہو جاتے ہیں

اب دیکھئے کون آئے جنازے کو اٹھانے
یوں تار تو میرے سبھی بیٹوں کو ملے گا

اب اندریا مستقل رہتا ہے اس دلیز پر
جو ہماری منتظر رہتی تھیں آنکھیں بجھ گئیں

اگر کسی کی دعا میں اثر نہیں ہوتا
تو میرے پاؤں سے کیوں تیر آ کے لوٹ گیا

ابھی زندہ ہے ماں میری مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا
میں گھر سے جب نکلتا ہوں دعا بھی ساتھ چلتی ہے

جب بھی کشتی مری سیالب میں آ جاتی ہے
ماں دعا کرتی ہوئی خواب میں آ جاتی ہے

کہیں بے نور نہ ہو جائیں وہ بوڑھی آنکھیں
گھر میں ڈرتے تھے خبر بھی مرے بھائی دیتے

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے
ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لیگی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دیگی

قدموں میں لا کے ڈال دیں سب نعمتیں مگر
سوتیلی ماں کو بچے سے نفرت وہی رہی

دھنستی ہوئی قبروں کی طرف دیکھ لیا تھا
ماں باپ کے چہروں کی طرف دیکھ لیا تھا

کوئی دکھ ہو کبھی کہنا نہیں پڑتا اس سے
وہ ضرورت کو طلبگار سے پہچانتا ہے

کسی کو دیکھ کر روتے ہوئے ہنسنا نہیں اچھا
یہ وہ آنسو ہیں جن سے تخت سلطانی پلٹتا ہے

دن بھر کی مشقت سے بدن چور ہے لیکن
ماں نے مجھے دیکھا تو تھکن بھول گئی ہے

دعائیں ماں کی پہنچانے کو میلوں میل جاتی ہیں
کہ جب پر دلیں جانے کے لئے بیٹا نکلتا ہے

دیا ہے ماں نے مجھے دودھ بھی وضو کر کے
محاذ جنگ سے میں لوٹ کر نہ جاؤں گا

کھلونوں کی طرف بچے کو ماں جانے نہیں دیتی
مگر آگے کھلونوں کی دکاں جانے نہیں دیتی

دکھاتے ہیں پڑوئی ملک آنکھیں تو دکھانے دو
کہیں بچوں کے بوے سے بھی ماں کا گال کشنا ہے

بہن کا پیار ماں کی مامتا دو چینتی آنکھیں
یہی تخفے تھے وہ جن کو میں اکثر یاد کرتا تھا

برباد کر دیا ہمیں پرڈیس نے مگر
ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

بڑی بیچارگی سے لوٹتی بارات تکتے ہیں
بہادر ہو کے بھی مجبور ہوتے ہیں دہن والے

میرا بچپن تھا میرا گھر تھا کھلونے تھے مرے
مر پہ ماں باپ کا سایہ بھی غزل جیسا تھا

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے
کسی بچے کا جب پہلا سپارا ختم ہوتا ہے

کھانے کی چیزیں ماں نے جو بھیجی ہیں گاؤں سے
باسی بھی چو گئے ہیں تو لذت وہی رہی

میں وہ میلے میں بھٹکتا ہوا ایک بچہ ہوں
جسکے ماں باپ کو روتے ہوئے مر جانا ہے

ملتا جلتا ہے سبھی ماوں سے ماں کا چہرا
گردوارے کی بھی دیوار نہ گرنے پائے

منتظر ہونگی وہ پاکیزہ سی آنکھیں گھر میں
گھر کی دلیلیز پہ نشے میں کبھی مت جانا

میں نے کل شب چاہتوں کی سب کتابیں چھاڑ دیں
صرف ایک کاغذ پہ لکھا لفظِ ماں رہنے دیا

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلا میں آ گئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعا میں آ گئیں

میدان چھوڑ دینے سے میں نج تو جاؤں گا
لیکن جو یہ خبر میری ماں تک پہنچ گئی

منور ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رونا
جبہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی

مشی لپٹ لپٹ گئی پیروں سے اسلئے
تیار ہو کے بھی کبھی ہجرت نہ کر سکے

مفلسی بچے کو رونے نہیں دینا ورنہ
ایک آنسو بھرے بازار کو کھا جائیگا

مجھے خبر نہیں جنت بڑی کہ ماں لیکن
بزرگ کہتے ہیں جنت بشر کے نیچے ہے

مجھے کڑھے ہوئے تکیئے کی کیا ضرورت ہے
کسی کا ہاتھ ابھی میرے سر کے نیچے ہے

بزرگوں کا مرے دل سے ابھی تک ڈر نہیں جاتا
کہ جب تک جاگتی رہتی ہے ماں میں گھر نہیں جاتا

محبت کرتے جاؤ بس یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی ملہ مدینہ مان لیتی ہے

ماں یہ کہتی تھی کہ موتی ہیں ہمارے آنسو
اسلئے اشکوں کا پینا بھی بُرا لگتا ہے

پر دلیں جانے والے کبھی لوٹ آئیں گے
لیکن اس انتظار میں آنکھیں چلی گئیں

شہر کے رستے ہوں چاہے گاؤں کی پگڈیاں
ماں کی انگلی تھام کر چلنا بہت اچھا لگا

میں کوئی احسان مانوں بھی تو آخر کسلئے
شہر نے دولت اگر دی ہے تو بیٹا لے لیا

اب بھی روشن ہیں تیری یاد سے گھر کے کمرے
روشنی دیتا ہے اب تک ترا سایہ مجھکو

میرے چہرے پہ ممتا کی فراوانی چمکتی ہے
میں بوڑھا ہو رہا ہوں پھر بھی پیشانی چمکتی ہے

وہ جا رہا ہے گھر سے جنازہ بزرگ کا
آنگن میں اک درخت پرانا نہیں رہا

وہ تو لکھا کے لائی ہے قسم میں جا گناہ
ماں کیسے سو سکے گی کہ بیٹا سفر میں ہے

شانزادے کو یہ معلوم نہیں ہے شاید
ماں نہیں جانتی دستار کا بوسہ لینا
آنکھوں سے مانگنے لگے پانی وضو کا ہم
کاغذ پہ جب بھی دیکھ لیا مان لکھا ہوا
ابھی تو میری ضرورت ہے میرے بچوں کو
بڑے ہوئے تو یہ خود انتظام کر لیں گے
میں ہوں مرا بچہ ہے کھلونوں کی دکاں ہے
اب کوئی مرے پاس بہانہ بھی نہیں ہے
اے خدا تو فیس کے پیے عطا کر دے مجھے
میرے بچوں کو بھی یونیورسٹی اچھی لگی
بھیک سے تو بھوک اچھی گاؤں کو واپس چلو
شہر میں رہنے سے یہ بچہ بُرا ہو جائے گا
کھلونوں کے لئے بچے ابھی تک جاتے ہوں گے
تجھے اے مفلسی کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا ہے

ممتا کی آبرو کو بچایا ہے نیند نے
بچہ زیں پہ سو بھی گیا کھلتے ہوئے

میرے بچے نامرادی میں جواں بھی ہو گئے
میری خواہش صرف بازاروں کو تکتی رہ گئی

بچوں کی فیس، انکی کتابیں، قلم، دوات
میری غریب آنکھوں میں اسکول چھپ گیا

وہ سمجھتے ہی نہیں ہیں مری مجبوری کو
اسلئے بچوں پہ غصہ بھی نہیں آتا ہے

کسی بھی رنگ کو پہچانا مشکل نہیں ہوتا
مرے بچوں کی صورت دیکھ اسکو زرد کہتے ہیں

دھوپ سے مل گئے ہیں پیڑ ہمارے گھر کے
میں سمجھتی تھی کہ کام آئے گا بیٹا اپنا

چلو مانا کہ شہنائی مرت کی نشانی ہے
مگر وہ شخص جسکی آکے بیٹی بیٹھ جاتی ہے

پھر اس کو مرکے بھی خود سے جدا ہونے نہیں دیتی
یہ مٹی جب کسی کو اپنا بیٹا مان لیتی ہے

تمام عمر سلامت رہیں دعا ہے یہی
ہمارے سر پہ ہیں جو ہاتھ برکتوں والے

ہماری مفلسی ہم کو اجازت تو نہیں دیتی
مگر ہم تیری خاطر کوئی شہزادہ بھی دیکھیں گے

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں ایک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

دوستی دشمنی دونوں شامل رہیں دوستوں کی نوازش تھی کچھ اس طرح
کاٹ لے شوخ بچپہ کوئی جس طرح ماں کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کیے ساتھ چلتی رہی
ایک بچہ کتابیں لئے ہاتھ میں خامشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتے رہے اپنی شاخیں شمردار کرتے ہوئے

ابھی موجود ہے اس گاؤں کی مٹی میں خودداری
ابھی بیوہ کی غیرت سے مہاجن ہار جاتا ہے

معلوم نہیں کیسی ضرورت نکل آئی
سر کھولے ہوئے گھر سے شرافت نکل آئی

اس میں بچوں کی جلی لاشوں کی تصویریں ہیں
دیکھنا ہاتھ سے اخبار نہ گرنے پائے

اوڑھے ہوئے بدن پہ غربی چلے گئے
بہنوں کو روتا چھوڑ کے بھائی چلے گئے

کسی بوڑھے کی لائھی چھن گئی ہے
وہ دیکھو ایک جنازہ جا رہا ہے

آنگن کی تقسیم کا قصہ
میں جانوں یا بابا جانے

ہماری چیختی آنکھوں نے جلتے شہر دیکھے ہیں
بُرے لگتے ہیں اب قصے ہمیں بھائی بہن والے

اس لئے پس نے بزرگوں کی زمینیں چھوڑ دیں
میرا گھر جس دن بے گا تیرا گھر گر جائے گا

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

بچھڑ کے تجھ سے تری یاد بھی نہیں آئی
ہمارے کام یہ اولاد بھی نہیں آئی

مجھ کو ہر حال میں بخشنے گا اجالا اپنا
چاند رشتے میں نہیں لگتا ہے ماما اپنا

میں نرم مٹی ہوں تم روند کر گزر جاؤ
کہ میرے ناز تو بس کوزہ گر اٹھاتا ہے

مسائل نے ہمیں بوڑھا کیا ہے وقت سے پہلے
گھریلو الجھنیں اکثر جوانی چھین لیتی ہیں

اچھلتے کھلتے بچپن میں بیٹا ڈھونڈتی ہوگی
تبھی تو دیکھ کر پوتے کو دادی مسکراتی ہے

کچھ کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے
کاش ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

دولت سے محبت تو نہیں تھی مجھے لیکن
بچوں نے کھلونوں کی طرف دیکھ لیا تھا

جسم پر میرے بہت شفاف کپڑے تھے مگر
دھول مٹی میں اٹا بیٹا بہت اچھا لگا

کم سے کم بچوں کے ہونٹوں کی ہنسی کی خاطر
ایسی مٹی میں ملانا کہ کھلونا ہو جاؤں

قتسم دیتا ہے بچوں کی بہانے سے بلاتا ہے
دھواں چمنی کا ہم کو کارخانے سے بلاتا ہے

بچے بھی غریبی کو سمجھنے لگے شاید
اب جاگ بھی جاتے ہیں تو سحری نہیں کھاتے

انہیں فرقہ پرستی مت سکھا دینا کہ یہ بچے
زمیں سے چوم کرتیلی کے ٹوٹے پر اٹھاتے ہیں

سب کے کہنے سے ارادہ نہیں بدلا جاتا
ہر سہیلی سے دوپٹھے نہیں بدلا جاتا

بچھڑتے وقت بھی چبرا نہیں اترتا ہے
یہاں سرول سے دوپٹھے نہیں اترتا ہے

کانوں میں کوئی پھول بھی ہنس کر نہیں پہنا
اس نے بھی بچھڑ کر کبھی زیور نہیں پہنا

محبت بھی عجب شے ہے کوئی پر دلیں میں روئے
تو فوراً ہاتھ کی اک آدھ چوڑی ٹوٹ جاتی ہے

بڑے شہروں میں بھی رکبر برابر یاد کرتا تھا
میں اک چھوٹے سے اشیش کا منظر یاد کرتا تھا

کس کو فرصت اس محفل میں غم کی کہانی پڑھنے کی
سوئی کلائی دیکھ کے لیکن چوڑی والا ٹوٹ گیا

مجھے بلاتا ہے مقتل میں کس طرح جاؤں
کہ میری گود سے بچے نہیں اترتا ہے

کہیں کوئی کلائی ایک چوڑی کو ترستی ہے
کہیں کنگن کے جھٹکے سے کلائی ٹوٹ جاتی ہے

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے
جس دھوپ میں مزدور بھی چھپت پر نہیں جاتے

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو
اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

ہم نے بازار میں دیکھے ہیں گھریلو چہرے
مفلسی تجھ سے بڑے لوگ بھی دب جاتے ہیں

بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غربی کان چھدواتی ہے تنکا ڈال دیتی ہے

امیر شہر کا رشتے میں کوئی کچھ نہیں لگتا
غربی چاند کو بھی اپنا ماما مان لیتی ہے

تو کیا مجبوریاں بے جان چیزیں بھی سمجھتی ہیں
گلے سے جب اترتا ہے تو زیور کچھ نہیں کہتا

کہیں بھی چھوڑ کے اپنی زمیں نہیں جاتے
ہمیں بُلاتی ہے دنیا ہمیں نہیں جاتے

زمیں بخوبی ہو جائے تو چاہت کم نہیں ہوتی
کہیں کوئی وطن سے بھی محبت چھوڑ سکتا ہے

ضرورت روز بھرت کے لئے آواز دیتی ہے
محبت چھوڑ کر ہندوستان جانے نہیں دیتی

پیدا یہیں ہوا ہوں یہیں پر مروں گا میں
وہ اور لوگ تھے جو کراچی چلے گے

میں مروں گا تو یہیں دفن کیا جاؤں گا
میری مٹی بھی کراچی نہیں جانے والی

وطن کی راہ میں دینی پڑے گی جان اگر
خدا نے چاہا تو ثابت قدم ہی نکلیں گے

وطن سے دور بھی یا رب وہاں پہ م نکلے
جہاں سے ملک کی سرحد دکھائی دینے لگے



بزرگ

خود سے چل کر نہیں یہ طرزِ سخن آیا ہے
پاؤں دابے ہیں بزرگوں کے تو فن آیا ہے

ہمیں بزرگوں کی شفقت کبھی نہ مل پائی
نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوفروں میں رہنے لگے

ہمیں گرتی ہوئی دیوار کو تھامے رہے ورنہ
سلیقے سے بزرگوں کی نشانی کون رکھتا ہے

روش بزرگوں کی شامل ہے میری گھٹتی میں
ضرورتاً بھی سخنی کی طرف نہیں دیکھا

سرک سے جب گزرتے ہیں تو بچے پیڑ گنتے ہیں
بڑے بوڑھے بھی گنتے ہیں وہ سوکھے پیڑ گنتے ہیں

حوالیوں کی چھتیں گر گئیں مگر اب تک
مرے بزرگوں کا نقہ نہیں اترتا ہے

بلک رہے ہیں زمینوں پہ بھوک سے بچے
مرے بزرگوں کی دولت کھنڈر کے نیچے ہے

مرے بزرگوں کو اسکی خبر نہیں شاید
پنپ نہیں سکا جو پیر برگدوں میں رہا

عشق میں رائے بزرگوں سے نہیں لی جاتی
آگ بُجھتے ہوئے چولہوں سے نہیں لی جاتی

مرے بزرگوں کا سایہ تھا جب تملک مجھ پر
میں اپنی عمر سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا

بڑے بوڑھے کو میں میں نیکیاں کیوں چھینک آتے ہیں
کنوں میں چھپ کے آخر کیوں یہ نیکی بیٹھ جاتی ہے

مجھے اتنا ستایا ہے مرے اپنے عزیزوں نے
کہ اب جنگل بھلا لگتا ہے گھر اچھا نہیں لگتا



خود

ہمارے کچھ گناہوں کی سزا بھی ساتھ چلتی ہے
ہم اب تنہا نہیں چلتے دوا بھی ساتھ چلتی ہے

کچے شمر شجر سے الگ کر دیے گئے
ہم کمنی میں گھر سے الگ کر دیے گئے

گوتم کی طرح گھر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کہیں باہر نہیں جاتے

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے
یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

اتنا روئے تھے لپٹ کر درودیوار سے ہم
شہر میں آ کے بہت دن رہے یکار سے ہم

میں اپنے بچوں سے آنکھیں ملا نہیں سکتا
میں خالی جیب لیے اپنے گھر نہ جاؤں گا

ہم ایک تتلی کی خاطر بھکتے پھرتے تھے
کبھی نہ آئیں گے وہ دن شراتوں والے

مجھے سنجھانے والا کہاں سے آئے گا
میں گر رہا ہوں پرانی عمارتوں کی طرح

پیروں کو میرے دیدھے تر باندھے ہوئے ہے
زنجیر کی صورت مجھے گھر باندھے ہوئے ہے

دل ایسا کہ سیدھے کیے جوتے بھی بڑوں کے
ضد اتنی کہ خود تاج اٹھا کر نہیں پہنا

چمک ایسے نہیں آتی ہے خودداری کے چہرے پر
انا کو ہم نے دو دو وقت کا فاقہ کرایا ہے

ذرا سی بات پہ آنکھیں برسنے لگتی تھیں
کہاں چلے گئے موسم وہ چاہتوں والے

میں اس خیال سے جاتا نہیں ہوں گاؤں کبھی
وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے بچپنا میرا

ہم نہ دلی تھے نہ مزدور کی بیٹی لیکن
قافلے جو بھی ادھر آئے ہمیں لوت گئے

اب مجھے اپنے حریفوں سے ذرا بھی ڈر نہیں
میرے کپڑے بھائیوں کے جسم پر آنے لگے

تہا مجھے کبھی نہ سمجھنا مرے حریف
ایک بھائی مر چکا ہے مگر ایک گھر میں ہے

میدان سے اب لوٹ کے جانا بھی ہے دشوار
کس موڑ پہ دشمن سے قربت نکل آئی

مقدار میں لکھا کر لائے ہیں ہم دربدر پھرنا
پرندے کوئی موسم ہو پریشانی میں رہتے ہیں

میں پڑیوں کی طرح زمیں پر پڑا رہا
سینے سے غم گزرتے رہے ریل کی طرح

میں ہوں مٹی تو مجھے کوزہ گروں تک پہنچا
میں کھلونا ہوں تو بچوں کے حوالے کر دے

ہماری زندگی کا اس طرح ہر سال کتنا ہے
کبھی گاڑی پلتی ہے کبھی ترپال کتنا ہے

شاید ہمارے پاؤں میں تل ہے کہ آج تک
گھر میں کبھی سکون سے دو دن نہیں رہے

میں وصیت کر سکا کوئی نہ وعدہ لے سکا
میں نے سوچا بھی نہیں تھا حادثہ ہو جائے گا

ہم بہت تھک ہار کے لوٹے تھے لیکن جانے کیوں
رینگتی، بڑھتی، سرکتی چیزوں پر اچھی لگیں

مدتوں بعد کوئی شخص ہے آنے والا
اے مرے آنسوہ تم دیدھہ تر میں رہنا

تكلفات نے زخموں کو کر دیا ناسور
کبھی مجھے کبھی تاخیر چارہ گر کو ہوئی

اپنے بکنے کا بہت دکھ ہے ہمیں بھی لیکن
مسکراتے ہوئے ملتے ہیں خریدار سے ہم

ہمیں دن تاریخ تو یاد نہیں بس اس سے اندازہ کرلو
ہم اس موسم میں بچھڑے تھے جب گاؤں میں جھولا پڑتا ہے

میں اک فقیر کے ہونوں کی مسکراہٹ ہوں
کسی سے بھی مری قیمت ادا نہیں ہوتی

ہم تو اک اخبار سے کائی ہوئی تصویر ہیں
جس کو کاغذ چنے والے کل اٹھا لے جائیں گے

انا نے میرے بچوں کی ہنسی بھی چھین لی مجھ سے
یہاں جانے نہیں دیتی وہاں جانے نہیں دیتی

جانے اب کتنا سفر باقی بچا ہے عمر کا
زندگی ابلے ہوئے کھانے تک تو آگئی

ہمیں بچوں کا مستقبل لئے پھرتا ہے سڑکوں پر
نہیں تو گرمیوں میں کب کوئی گھر سے نکلتا ہے

سونے کے خریدار نہ ڈھونڈو کہ یہاں پر
اک عمر ہوئی لوگوں نے پیتل نہیں دیکھا

میں اپنے گاؤں کا مکھیا بھی ہوں بچوں کا قاتل بھی
جلاء کر دو دھن پکھھ لوگوں کی خاطر گھی بناتا ہوں



بہن

کس دن کوئی رشتہ مری بہنوں کو ملے گا
کب نیند کا موسم مری آنکھوں کو ملے گا

میری گڑیا سی بہن کو خودکشی کرنی پڑی
کیا خبر تھی دوست میرا اس قدر گر جائے گا

کسی بچے کی طرح پھوٹ کے روئی تھی بہت
اجنبی ہاتھ میں وہ اپنی کلائی دیتے

جب یہ سنا کہ ہار کے لوٹا ہوں جنگ سے
راکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

چاہتا ہوں کہ تیرے ہاتھ بھی پیلے ہو جائیں
کیا کروں میں کوئی رشتہ ہی نہیں آتا ہے

ہر خوشی بیان پہ لایا ہوا دھن لگتی ہے
اور اداسی مجھے منہہ بولی بہن لگتی ہے
دھوپ رشتؤں کی نکل آئے گی یہ آس لئے
گھر کی دہلیز پہ بیٹھی رہیں بہنیں میری
اسلنے بیٹھی ہیں دہلیز پہ میری بہنیں
پھل نہیں چاہتے تاعمر شجر میں رہنا
ناامیدی نے بھرے گھر میں اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بُجھ گئیں



بھائی

میں اتنی بے بسی سے قیدِ دشمن میں نہیں مرتا
اگر میرا بھی اک بھائی لڑکپن میں نہیں مرتا

کانٹوں سے پچ گیا تھا مگر پھول چھ گیا
میرے بدن میں بھائی کا ترشول چھ گیا

اے خدا تھوڑی کرم فرمائی ہونا چاہئے
اتنی بہنیں ہیں تو پھر اک بھائی ہونا چاہئے

باپ کی دولت سے یوں دونوں نے حصہ لے لیا
بھائی نے دستار لے لی میں نے جوتا لے لیا

نہتا دیکھ کے مجھ کو لڑائی کرتا ہے
جو کام اس نے کیا ہے وہ بھائی کرتا ہے

یہی گھر تھا جہاں مل جل کے سب اک ساتھ رہتے تھے
یہی گھر ہے الگ بھائی کی افطاری نکلتی ہے

وہ اپنے گھر میں روشن ساری شمعیں گنتا رہتا ہے
اکیلا بھائی خاموشی سے بہنیں گنتا رہتا ہے

میں اپنے بھائیوں کے ساتھ جب باہر نکلتا ہوں
مجھے یوسف کے جانی دشمنوں کی یاد آتی ہے

مرے بھائی وہاں پانی سے روزہ کھولتے ہوں گے
ہٹا لو سامنے سے مجھ سے افطاری نہیں ہوگی

جہاں پر گن کے روٹی بھائیوں کو بھائی دیتے ہیں
سبھی چیزیں وہاں دیکھیں مگر برکت نہیں دیکھی

رات دیکھا ہے بہاروں پہ خزان کو ہنستے
کوئی تھفہ مجھے شاید مرا بھائی دیگا

تمہیں اے بھائیو یوں چھوڑنا اچھا نہیں لیکن
ہمیں اب شام سے پہلے ٹھکانا ڈھونڈ لینا ہے

غم سے کچھ من کی طرح بھائی کا رشتہ ہے مرا
مجھ کو جنگل میں اکیلا نہیں رہنے دیتا

جو لوگ کم ہوں تو کاندھا ضرور دے دینا
سرہانے آ کے مگر بھائی بھائی مت کرنا

محبت کا یہ جذبہ جب خدا کی دین ہے بھائی
تو میرے راستے سے کیوں یہ دنیا ہٹ نہیں جاتی

یہ قرب قیامت ہے لہو کیا منور
پانی بھی تجھے تیرا برادر نہیں دیگا

آپنے کھل کے محبت نہیں کی ہے ہم سے
آپ بھائی نہیں کہتے ہیں میاں کہتے ہیں



پنج

فرشته آ کے انکے جنم پر خوشبو لگاتے ہیں
وہ بچے ریل کے ڈبے میں جو جھاڑو لگاتے ہیں

ہمکتے کھلتے بچوں کی شیطانی نہیں جاتی
مگر پھر بھی ہمارے گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اپنے مستقبل کی چادر پر رو کرتے ہوئے
مسجدوں میں دیکھیئے بچے وضو کرتے ہوئے

مجھے اس شہر کی سب لڑکیاں آداب کرتی ہیں
میں بچوں کی کلائی کے لئے راکھی بناتا ہوں

گھر کا بوجھ اٹھانے والے بچے کی تقدیر نہ پوچھ
بچپن گھر سے باہر نکلا اور کھلونا ٹوٹ گیا

جو اشک گونگے تھے وہ عرضِ حال کرنے لگے
ہمارے بچے ہمیں سے سوال کرنے لگے

جب ایک واقعہ بچپن کا ہم کو یاد آیا
ہم ان پرندوں کو پھر گھونسلے میں چھوڑ آئے

بھرے شہروں میں قربانی کا موسم جب سے آیا ہے
مرے بچے کبھی ہولی میں پچکاری نہیں لاتے

مسجد کی چٹائی پہ یہ سوتے ہوئے بچے
ان بچوں کو دیکھو کبھی ریشم نہیں دیکھا

بھوک سے بے حال بچے تو نہیں روئے مگر
گھر کا چوہا مفلسی کی چغلیاں کھانے لگا

تموار تو کیا میری نظر تک نہیں اٹھی
اس شخص کے بچوں کی طرف دیکھ لیا تھا

ریت پر کھیلتے بچوں کو ابھی کیا معلوم
کوئی سیلا ب گھروندہ نہیں رہنے دیتا

دھواں بادل نہیں ہوتا کہ بچپن دوڑ پڑتا ہے
خوشی سے کون بچہ کارخانے تک پہنچتا ہے

میں چاہوں تو مٹھائی کی دکانیں کھول سکتا ہوں
مگر بچپن ہمیشہ رام دانے تک پہنچتا ہے

ہوا کے رخ پر رہنے دو یہ جلنا سیکھ جائے گا
کہ بچہ لڑکھڑائے گا تو چلنا سیکھ جائے گا

اک سُلکتے شہر میں بچہ ملا ہوتا ہوا
سمبے سمبے سے چراغوں کے اجائے کی طرح

میں نے اک مدت سے مسجد بھی نہیں دیکھی مگر
ایک بچے کا اذال دینا بہت اچھا لگا

انہیں اپنی ضرورت کے ٹھکانے یاد رہتے ہیں
کہاں پر ہے کھلونوں کی دکان بچے سمجھتے ہیں

زمانہ ہو گیا دنگے میں اس گھر کو جلنے لیکن
کسی بچے کے رونے کی صدائیں روز آتی ہیں



کسی بھی موڑ پر تم سے وفاداری نہیں ہوگی
ہمیں معلوم ہے تم کو یہ بیماری نہیں ہوگی

نیم کا پیڑ تھا برسات تھی اور جھولا تھا
گاؤں میں گزرا زمانہ بھی غزل جیسا تھا

ہم کچھ ایسے ترے دیدار میں کھو جاتے ہیں
جیسے پچھے بھرے بازار میں کھو جاتے ہیں

تجھے اکیلے پڑھوں کوئی ہم سبق نہ رہے
میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر کسی کا حق نہ رہے

وہ اپنے کاندھوں پر کنے کا بوجھ رکھتا ہے
اسی لئے تو قدم سوچ کر انھاتا ہے

آنکھیں تو اسے گھر سے نکلنے نہیں دیتیں
آنسو ہیں کہ سامان سفر باندھے ہوئے ہیں

سفیدی آ گئی بالوں میں اس کے
وہ باعزت گھرانا چاہتا تھا

نہ جانے کون سی مجبوریاں پر دلیں لائی تھیں
وہ جتنی دیر تک زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا

تلash کرتے ہیں ان کو ضرورتوں والے
کہاں گئے وہ پرانی شرافتوں والے

وہ خوش ہے کہ بازار میں گالی مجھے دے دی
میں خوش ہوں کہ احسان کی قیمت نکل آئی

اسے جلی ہوئی لاشیں نظر نہیں آتیں
مگر وہ سوئی سے دھاگا گزار دیتا ہے

وہ پھر وہ بینٹھ کر طوٹے سے باتیں کرتا رہتا ہے
چلو اچھا ہے اب نظریں بدلا سکیجے جائے گا

اسے حالات نے روکا مجھے میرے مسائل نے
وفا کی راہ میں دشواریاں دونوں طرف سے ہیں

تجھے فے پچھرا تو پند آ گئی بے ترتیبی
اس سے پہلے مرا کمرا بھی غزل جیسا تھا

کہاں کی بھر تیں کیا سفر کیا جدا ہونا
کسی کی چاہ پیروں پر دوپٹہ ڈال دیتی ہے

غزل وہ صنف نازک ہے جسے اپنی رفاقت سے
وہ محبوبہ بنا لیتا ہے میں بیٹی بناتا ہوں

وہ ایک گڑیا جو میلے میں کل دکان پر تھی
دنوں کی بات ہے پہلے میرے مکان پر تھی

لڑکپن میں کیے وعدے کی قیمت کچھ نہیں ہوتی
انگوٹھی ہاتھ میں رہتی ہے منگنی ٹوٹ جاتی ہے

وہ جسکے واسطے پر دلیں جا رہا ہوں میں
پچھرتے وقت اسی کی طرف نہیں دیکھا



متفرقفات

ہم سایہ دار پیڑ زمانے کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو جلانے کے کام آئے

کوئل بولے یا گوریا اچھا لگتا ہے
اپنے گاؤں میں سب کچھ بھی اچھا لگتا ہے

خاندانی وراثت کے نیلام پر آپ اپنے کو تیار کرتے ہوئے
اس حویلی کے سارے مکیں رو دیئے اس حویلی کو بازار کرتے ہوئے

اڑنے سے پندے کو شجر روک رہا ہے
گھر والے تو خاموش ہیں گھر روک رہا ہے

وہ چاہتی ہے کہ آنگن میں موت ہو میری
کہاں کی مئی ہے مجھ کو کہاں بلا قی ہے

نماش پر بدن کی یوں کوئی تیار کیوں ہوتا
اگر سب گھر کے ہو جاتے تو یہ بازار کیوں ہوتا

کچا سمجھ کے نج نہ دینا مکان کو
شاید کبھی یہ سر کو چھپانے کے کام آئے

اندھیری رات میں اکثر شہری مشعلیں لیکر
پرندوں کی مصیبت کا پتہ جگنو لگاتے ہیں

تو نے ساری بازیاں جیتی ہیں مجھ پر بیٹھ کر
اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اصطبل بھی چاہیے

مہاجرو یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برآمدوں میں رہا

تمہاری آنکھوں کی توہین ہے ذرا سوچو
تمہارا چاہنے والا شراب پیتا ہے

کسی دکھ کا کسی چہرے سے اندازہ نہیں ہوتا
شجر تو دیکھنے میں سب ہرے معلوم ہوتے ہیں

ضرورت سے انا کا بھاری پھر ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر آدمی بھی اندر اندر ٹوٹ جاتا ہے

محبت ایک ایسا کھیل ہے جس میں مرے بھائی
ہمیشہ جینے والے پریشانی میں رہتے ہیں
پھر کبوتر کی وفاداری پہ شک مت کرنا
وہ تو گھر کو اسی میnar سے پہچانتا ہے
انا کی موئی صورت بگاڑ دیتی ہے
بڑے بڑوں کو ضرورت بگاڑ دیتی ہے
بنا کر گھونسلہ رہتا تھا اک جوڑا کبوتر کا
اگر آندھی نہیں آتی تو یہ میnar پج جاتا
ان گھروں میں جہاں مٹی کے گھرے رہتے ہیں
قد میں چھوٹے ہوں مگر لوگ بڑے رہتے ہیں
پیاس کی شدت سے منہہ کھولے پرندہ گر پڑا
سیڑھیوں پر ہانپتے اخبار والے کی طرح
وہ چڑیاں تھیں دعائیں پڑھ کے جو مجھ کو جگاتی تھیں
میں اکثر سوچتا تھا یہ تلاوت کون کرتا ہے

پرندے چونچ میں تنگے دبائے جاتے ہیں
میں سوچتا ہوں کہ اب گھر بسا لیا جائے

اے مرے بھائی مرے خون کا بدلہ لے لے
ہاتھ میں روز یہ تلوار نہیں آئے گی

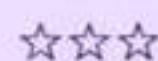
نئے کمروں میں اب چیزیں پرانی کون رکھتا ہے
پرندوں کے لئے شہروں میں پانی کون رکھتا ہے

جسکو بچوں میں پہنچنے کی بہت عجلت ہو
اس سے کہیئے نہ کبھی کار چلانے کے لئے

سو جاتے ہیں فٹ پاٹھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

پیٹ کی خاطرفٹ پاٹھوں پر بیچ رہا ہوں تصویریں
میں کیا جانوں روزہ ہے یا میرا روزہ ٹوٹ گیا

جب اس سے گفتگو کر لی تو پھر شجرہ نہیں پوچھا
ہنر بخیہ گری کا ایک ترپائی میں کھلتا ہے



غربت

گھر کی دیوار پہ کوئے نہیں اچھے لگتے
مفلسی میں یہ تماثی نہیں اچھے لگتے

مفلسی نے سارے آنگن میں اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بُجھ گئیں

امیری ریشم و کنواب میں ننگی نظر آئی
غربی شان سے اکٹ کے پردے میں رہتی ہے

اسی گلی میں وہ بھوکا کسان رہتا ہے
یہ وہ زمیں ہے جہاں آسمان رہتا ہے

دلہینر پہ سر کھولے کھڑی ہوگی ضرورت
اب ایسے میں گھر جانا مناسب نہیں ہوگا

عید کے خوف نے روزوں کا مزہ چھین لیا
مفلسی میں یہ مہینہ بھی بُرا لگتا ہے

اپنے گھر میں سر جھکائے اسلئے آیا ہوں میں
اتنی مزدوری تو بچے کی دوا کھا جائے گی

اللہ غریبوں کا مددگار ہے رانا
ہم لوگوں کے بچے کبھی سردی نہیں کھاتے

بوجھ اٹھانا شوق کہاں ہے مجبوری کا سودا ہے
رہتے رہتے اشیش پر لوگ قُلی ہو جاتے ہیں



بیٹی

گھروں میں یوں سیانی اڑکیاں بے چین رہتی ہیں
کہ جیسے ساحلوں پر کشتیاں بے چین رہتی ہیں

یہ چڑیا بھی مری بیٹی سے کتنی ملتی جلتی ہے
کہیں بھی شاخ گل دیکھے تو جھولا ڈال دیتی ہے

رو رہے تھے سب تو میں بھی پھوٹ کر رونے لگا
ورنہ مجھ کو بیٹیوں کی خصتی اچھی لگی

بڑی ہونے لگی ہیں مورتیں آنگن میں مٹی کی
بہت سے کام باقی ہیں سنہالا لے لیا جائے

تو پھر جا کر کہیں ماں باپ کو کچھ چین پڑتا ہے
کہ جب سرال سے گھر آ کے بیٹی مسکراتی ہے

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ختم میلہ ہو گیا
اڑ گئیں آنگن سے چڑیاں گھر اکیلا ہو گیا



ماں



منور لٹن

